www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

حافظ حسن مدنی
مدیر معاون

اسلامی معاشرت

نکاح میں والدین کا کردار اور اولاد کے فرائض

حالیہ چند دنوں بعض اسلام بیزار خواتین کے اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے اور اسلام کے خاندانی نظام پر حملہ کرنے کی مذموم کوششوں کے بعد دوبارہ مسئلہ نکاح کے اسلامی احکام نمایاں کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ عدالتِ عالیہ کے مسلسل فیصلہ جات نے بھی اس ضرورت کو اجاگر کیا ہے...... اس خاص مرحلہ پر چند مخصوص احکامِ اسلامیہ کی بجائے بیسیوں ایسے عوامل اور رویے ہیں جن کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جن میں اسلامی ولایت عامہ وخاصہ کا تصور، حضانت و کفالت کے مسائل، صلہ رحمی اور اطاعت والدین کے احکام، اولی الامر کی ذمہ داریاں اور اولاد کے فرائض کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشروں میں صدیوں سے چلے آنے والی قدروں کو بھی اہم حیثیت حاصل ہے۔
زیر نظر مضمون یوں تو خواتین کے ایک اسلامی جریدہ میں چھپنے والی ایک مختصر تحریر کے ردّ عمل میں لکھا گیا لیکن حسن اتفاق سے اس میں مرحلۂ نکاح پر اسلامی تقاضوں کے متعدد اہم گوشے، خاص موزونیت کے ساتھ اجاگر ہو رہے ہیں اور یہ بذات خود ایک مستقل مضمون کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ چونکہ معاملہ بڑا وسیع الاطراف اور سنجیدہ نوعیت کا ہے لہٰذا اس میں طوالت سے بچنے کے لئے زیادہ تر اشاروں اور حوالہ جات ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے...... محدث کے قارئین کے اعلیٰ علمی معیار اور خاص علمی ذوق کی بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس سے بخوبی استفادہ کر سکیں گے، ان شاء اللہ
اسی مسئلے کے چند ایک مزید مباحث کو طوالت کے خوف سے کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھا گیا ہے......
اللہ تعالیٰ ہمیں اسلام کو صحیح معنوں میں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے...... آمین!

خواتین میگزین، مارچ ۹۹ء کا شمارہ میرے پیش نظر ہے جس میں نکاح میں "ولی کے کردار اور اولاد کی ذمہ داری" کے موضوع پر محترمہ امِ عمارہ صاحبہ نے روشنی ڈالی ہے۔ یہ موضوع اسلامی معاشرے کا ایک سنجیدہ اور دقیق تر موضوع ہے۔ جس میں اگر اسلام کے متوازن و معتدل رویے کو دقت نظر سے نہ سمجھا جائے تو لامحالہ افراط و تفریط پر مبنی صورت حال سے دوچار ہونا پڑے گا۔ خواتین میگزین میں، جو تعلیم یافتہ خواتین میں اسلامی جذبے کی آبیاری اور اسلامی حمیت و غیرت کی خوب خوب پاسداری کر رہا ہے اور دورِ حاضر کے الجھے مسائل میں خاتونِ مسلم کو اسلام کی سچی تعبیر کی روشنی مہیا کر رہا ہے، اس موضوع پر ضروری ہے کہ تفصیل سے، آزادانہ بنیادوں پر بحث و تمحیص کی جائے اور اس کے تمام پہلو زیر بحث لائے جائیں تاکہ اس حوالے سے جہاں اسلام کے قابل فخر خاندانی نظام کے مخفی گوشے اُجاگر

© rasailojaraid.com

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

ہو سکیں وہاں یہ روحانی تعلیمات پاکستانی قوم کے گھریلو اطمینان و سکون اور خواتین میں دلی اطمینان وایقان کا بھی باعث ہوں۔ مجھے بڑے افسوس سے اس اَمر کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے کہ اس موضوع پر زیر نظر مضمون میں پیش کردہ رائے ایک طرف توازن واعتدال سے عاری ہے تو دوسری طرف اس گھمبیر موضوع کے ضروری تقاضے بھی پورے نہیں کرتی۔ عجب بات یہ ہے کہ خواتین میگزین جس مخصوص طرزِ فکر کی ترجمانی کرتا ہے، اس کے اکابر کی آراء بھی اس مضمون میں پیش کردہ رائے سے مختلف ہیں۔ نہ معلوم اس تضاد کو کیوں محسوس نہیں کیا گیا...... نکاح میں ولی کا کردار ایک کثیر الجہت موضوع ہے جس کے مختلف پہلوؤں کو ہی سامنے رکھ کر اس معاملے میں اسلامی نقطۂ نظر سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ موضوع خواتین میگزین کی فکری عمارت کی بنیادی اینٹ ہے، جس کے ماننے یا نہ ماننے سے خواتین میں اباحیت پسندی یا اسلام پسندی کا امتیاز ہو جاتا ہے۔

وَلی کون ؟

سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ وَلی کا مفہوم سمجھا جائے۔ انگریزی میں چونکہ اس کا ترجمہ Gaurdian کیا جاتا ہے اور عربی میں بھی یہ لفظ مختلف سابقوں، لاحقوں کے ساتھ بعض اوقات غلام وآقا کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ اس لفظ کو پڑھتے ہی یہ تصور اُبھرتا ہے جیسے ایک سخت گیر شخص اپنے زیردست خواتین کے اُمور میں آزادانہ تصرف کا اختیار رکھتا ہے۔ جب کہ ولی سے مراد اس موقعہ پر وہ سب سے قریبی مرد ہے جو خون، نسب، جذبات اور ذمہ داری ہر لحاظ سے کسی عورت کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے عورت کے والدین، ان کی عدم موجودگی میں چچا، ماموں، حتیٰ کہ بعض صورتوں میں عورت کی اولاد وغیرہ بھی عورت کے ولی ہوتے ہیں۔ چونکہ فی زمانہ تحریک نسواں اپنے بامِ عروج پر ہے اور اس کے افکار کی ہر آزاد خیال دانشور جگالی کر رہا ہے، اس لیے انہی مفروضوں کو بار بار سننے کی بنا پر کسی عورت پر اس کے صنفِ مخالف کے کسی فرد کی ذمہ داری چاہے وہ اس کا والد یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، فوراً ہمارے ذہنوں میں صنفی جبر واستبداد کو تازہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ مردوں کی اس ذمہ داری کو اچھے رنگ میں لینے کی بجائے فوراً منفی تاثرات جنم لینا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب کہ اس قدر قریبی خونی رشتہ داروں کی بابت رحم دلی اور خلوص ومحبت کے ماسوا دوسرے غاصبانہ کردار کی توقع عام مشاہدے کی رو سے بہت کم کی جاسکتی ہے۔ اس ضمن میں والدین کا مشفقانہ کردار دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

عورت کو ولی کی ضرورت کیوں ؟

اس امر کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟...... اس سوال کے جواب سے پہلے مرد وعورت کے

© rasailojaraid.com

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

صنفی تجزیے کو سامنے رکھنا اور کارزارِ حیات میں ان کے کردار کو پیش نظر رکھنا اشد ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تجزیے اکثریت اور عام مشاہدے کی بنا پر ہی حاصل ہوتے ہیں، استثنائی مثالوں یا نوادرات سے عام رویے اور مزاج نہیں بدلا کرتے......

خواتین میں عموماً جذبات کا غلبہ ہوتا ہے، وہ جذباتیت پسند واقع ہوئی ہیں اور یہ ان کی فطرت کا خوبصورت پہلو ہے۔ یہی وہ غلبہ ہے جو انہیں ماں بننے اور دوسروں کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ رکھتا ہے۔ قرآنِ کریم خواتین کی ایک دوسری صفت یہ بیان کرتا ہے اور وہ یہ کہ خواتین مردوں کی بنسبت اپنی جبلت و فطرت کی بنا پر بیک وقت ایک معاملے میں منفی اور مثبت پہلوؤں پر معتدلانہ نظر نہیں رکھ سکتیں، جھگڑا یا اختلاف کے موقع پر بھی دوٹوک انداز میں مسئلہ کا ادراک کر کے اپنے موقف کو پیش کرنے کی بجائے غیر واضح تر اور جذبات سے مغلوب ردّ عمل پیش کرتی ہیں۔ (الزخرف:۱۸)

اسی طرح مردوں کے اس معاشرے میں جہاں اسلام ہر دو اصناف کو ایک خاص فاصلے پر رہنے کی تلقین کرتا ہے، مرد کی بنسبت خواتین صنفِ مخالف کی پوری پوری چھان پھٹک کرنے پر بھی قادر نہیں ہو سکتیں۔ علاوہ ازیں خواتین میں فطری شرم وحیا کے سبب اپنے آپ کو نکاح کے لیے پیش کرنا بھی شدید معیوب سمجھا جاتا ہے اور بالفرض اس وقت جبکہ عورت کی طرف سے نکاح کی پیشکش پر مرد اسے قبول نہ کرے تو اس عورت کا ردّ عمل اور اشتعال پردۂ تخیل میں بھی بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ خواتین کے بارے میں یہ امر بھی معروف ہے کہ ان میں مردوں کے مقابلے میں خاندانی غیرت وحمیت بھی کم ہوتی ہے کیونکہ اپنے نسبی خاندان سے انہیں جلد ہی سسرالی خاندان کی طرف منتقل ہونا ہوتا ہے اگر ان میں نسلی خاندان سے لگاؤ زیادہ ہو تو نئے گھر اور خاندان میں ان کا بس جانا ایک ناممکن الوقوع امر متصور ہوتا۔ بالخصوص رشتۂ نکاح کے بارے میں خواتین شدید جذباتی ہوتی ہیں اور ان کے مرد کے دامِ فریب میں بآسانی آنے کے امکانات بہت قوی ہوتے ہیں...... یہی وہ بنیادی وجوہات ہیں کہ اسلام نے اس معاملے میں ان کے قریب ترین مرد حضرات کو ان کی مدد کا حکم دیا ہے کہ عورتیں اپنا معاملہ خود طے کرنے کی بجائے اپنے والدین کے توسط سے طے کرائیں۔ اس میں ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ مرد کے توسط سے ہونے والے معاملے میں آئندہ بصورتِ اختلاف عورت کو قانونی و معاشرتی جنگ لڑنی آسان ہو جائے گی۔ خدانخواستہ اگر اسے واپس طلاق یافتہ صورت میں لوٹنا پڑتا ہے تو اپنے والدین کے دامِ عافیت میں وہ دوبارہ سر چھپا سکے گی۔ یہی والدین دوبارہ اس کے نان ونفقہ اور مناسب بر کی تلاش میں اس کی مدد کریں گے۔

ولی/والدین کے کردار کی حد بندی

''حیاتِ انسانی کی فلاح'' کا عادلانہ تعین، انسان کے بس سے باہر کی چیز ہے انسان اپنے تجربے

© rasailojaraid.com

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

ومشاہدے کی بنیاد پر اگر ایک پہلو کو ترجیح دیتا ہے تو دوسری طرف دوسرا پہلو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے، یورپ اور امریکہ کی کہانی اسی پریشان فکری کی مظہر ہے۔ انہوں نے انسان کو اپنے جیسے دوسرے انسانوں کا محتاج اور غلام دیکھا اور ان کے معاشرے نے صدیوں اس کی بھیانک مثالیں پیش کیں تو انہوں نے افراط و تفریط کا شکار ہو کر دوسری جانب حقوقِ انسانی کا ڈھنڈورا پیٹ دیا۔ جس کے شور میں فرائض کا تذکرہ فکر و ذہن سے اوجھل ہو گیا۔ آج حقوقِ انسانی کے بلند بانگ دعوؤں اور نعروں میں مغرب ایک دوسری انتہا کو چھو رہا ہے۔ اور جلد ہی یہ انتہا بھی ایک نئی منزل کی راہ دکھانے والی ہے۔ جس کے بعد پریشان فکر عالم جدید پھر انسانی تجربہ اور مشاہدے کی کسوٹی پر پورا اُترنے والی کسی اور منزل کی طرف گامزن ہو جائے گا۔ لیکن افسوس کہ قوموں اور نظریات کے سفر صدیوں پر محیط ہوتے ہیں اور ہر دو انتہاؤں میں ہزاروں مظلوم کچلے جاتے ہیں۔ انسان کے قلب و ذہن اور فکر و تخیل میں وہ وسعت اور قوت نہیں کہ وہ ہمہ گیر اور جامع تر نظامِ عدل و انصاف پیش کر سکے۔ ہر موقع محل کے اعتبار سے مختلف رویہ اور طرزِ فکر اپنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی جامعیت اور ہمہ گیریت اسلام کا امتیاز ہے جو کون و مکان میں ہر ہر جگہ قابل عمل اور مسائل کا حل ہے۔ اسلام میں ہی وہ وسعت ہے جو ہر مسئلے کا حل انوارِ الٰہی سے کشید کر سکتی ہے۔ "اللہ کا بہت بڑا احسان ہے مسلمانوں پر کہ اس نے حیاتِ انسانی کی فلاح کا معجز نما دین ہمیں عطا فرما دیا۔" (آل عمران:۱۶۴)

اگر ہمارے ذہن ہی لادین افکار کی بوچھاڑ سے متاثر ہو کر اور ان کے اٹھائے اعتراضات سے آلودہ ہو کر اسلام کی بھی اسی رنگ میں تعبیر شروع کر دیں تو یہ ملتِ اسلامیہ کی بد بختی ہوگی۔ اسلام سے مستفید ہونے کے لیے سب سے پہلے یہ اعتماد و ایقان ضروری ہے کہ ...... "اسلام ہی فلاحِ کل ہے۔"

ہمارے پیش نظر موضوع، نکاح کے بارے میں والدین اور اولاد کے کردار کی حد بندی ہے۔ حقوقِ نسواں کے علمبردار عورت کو یوں ہی مظلوم ٹھہراتے ہیں۔ اسلام میں تو جہاں عورت اپنا شوہر تلاش نہیں کر سکتی وہاں مرد بھی یہ کام خود نہیں کر سکتا۔ اگر مرد و عورت اس مرحلۂ نکاح پر انتخابِ زوج کی ذمہ داری ادا کرنے نکلیں تو لامحالہ ہر دو، صنفِ مخالف کے عشق میں گرفتار ہوئے بغیر انتخاب کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے۔ دونوں صنفوں کے درمیان کشش کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ بالخصوص عمر کے اس موڑ اور زندگی کے خاص مرحلے پر غیر اسلامی پیار و محبت کے سوا یہ کام ہونا ممکن نہیں۔ اور "اسلام نے تو جہاں مرد و عورت ہر دو کیلئے عشق بازی اور خفیہ دوستیوں پر مبنی نکاح حرام کر دیئے ہیں۔" (سورۃ المائدہ:۵) وہاں اس سے پہلے "مرد و عورت کی آزادانہ ملاقاتیں بھی صریحاً ممنوع ہیں" (حدیث صحیح مسلم:۹؍۱۴۴)

اسلامی نظامِ معاشرت میں مرد بھی اس بارے میں اپنی ماں اور بہنوں وغیرہ کا اس قدر زیادہ محتاج

© rasailojaraid.com
محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

ہے کہ ان کے بغیر وہ کوئی واضح اور ٹھوس قدم نہیں اٹھا سکتا۔ ہاں اگر زوج کی تلاش جان پہچان والے عزیز واقارب میں ہو تو بہر حال یہ ضرورت لڑکے اور لڑکی ہر دو کے لیے نسبتاً کم ہو جاتی ہے۔ اس آزمائش وانتخاب کے مرحلے میں ہر دو کی برابری کے بعد فرق پیش آتا ہے تو انتخاب کی تکمیل کے موقع پر...... اس موقعہ پر بھی شریعت ہر دو سے اطاعتِ والدین کا تقاضا کرتی ہے۔

واضح رہے کہ اطاعتِ والدین، اللہ کی اطاعت کے بعد دین کا دوسرا اہم ترین تقاضا ہے (سورۂ بنی اسرائیل: ۲۳) یہ صرف احسان و تلقین سے ہی عبارت نہیں بلکہ "والدین کی نافرمانی اکبرُ الکبائر میں سے ہے" (صحیح بخاری و مسلم) شریعت ہر دو سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنے والدین کی رضامندی بجا لائیں حتیٰ کہ بعض صورتوں میں خلفاءِ راشدین کے ایسے فیصلے بھی موجود ہیں کہ انہوں نے والدین کی ناراضگی کے باعث شادی شدہ جوڑوں کو طلاق کا حکم صادر فرمایا (سنن ابن ماجہ: ص ۱۴۵) حضرت ابراہیمؑ کے مشہور واقعے کو ذہن میں لائیے جو انہوں نے برسوں بعد اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کے گھر تشریف لانے پر اس کی بیوی کو چھوڑ دینے کا حکم (گھر کی چوکھٹ بدلنے کا کہہ کر) دیا تھا...... شریعت اطاعتِ والدین، صلۂ رحمی اور احسان سلوک کے ٹھوس نظام پر مبنی ہے۔

دوسری طرف والدین کو بھی حکم دیا گیا کہ بلاوجہ اپنی من مانیاں نہ کرتے رہیں بلکہ لڑکے اور لڑکی (اولاد) کو اس کا جائز حق استعمال کرنے دیں اگر والد اس کے باوجود اپنی من مانی پر مصر ہے تو عدالت میں جا کر جج، والد سے جواب طلبی اور اظہارِ وجوہ کا تقاضا کر سکتا ہے۔

اس کے بعد اسلام نے بطورِ قانون لڑکے کو تو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے نکاح کی بات چیت خود چلا سکتا ہے کیونکہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے فطری طور پر بعض خصوصیات اور صنفی رجحانات اس کو اجازت دیتے ہیں۔ لیکن عرف کی رو سے (جس کی اسلامی قانون میں مسلمہ حیثیت ہے) مرد کے لیے بھی یہ امر معیوب ہے کہ وہ اپنے نکاح کی بات چیت خود چلائے۔ دوسری طرف لڑکی کا معاملہ ہے تو یہاں اسلام والدین (وَلی) کو اس کی مدد اور اس کی پسند نافذ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں عورت کا نکاح اس کی مرضی سے والدین کے توسط سے انجام پاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم (جس کے الفاظ کلامِ الٰہی ہیں اور علماء نے اس کے ایک ایک شوشے سے اور طرزِ تکلم سے بیسیوں مسائل اَخذ کیے ہیں) میں کسی مقام پر بھی نکاح کرنے کی نسبت خواتین کی طرف نہیں کی گئی۔ بلکہ واضح فرق کے ساتھ مردوں کے نکاح کے موقع پر ﴿لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ﴾ "تم مشرکہ عورتوں سے نکاح مت کرو" اور عورت کے نکاح کے موقع پر ﴿لَا تُنْكِحُوا﴾ "اُن کے مرد اُن کا نکاح مت کریں" اور ﴿وَاَنْكِحُوا﴾ "مردو! تم ان کا نکاح کرو" وغیرہ کے الفاظ ہی ہمیشہ استعمال کیے ہیں۔ (تفصیل کیلئے دیکھیں تفاسیر قرطبی، ابن کثیر، مراغی، طبری اور تفسیر المنار وغیرہ زیرِ آیات: البقرہ/۲۲۱ و ۲۳۲، النور/۳۲، قصص/۲۷، احزاب/۵۰)

© rasailojaraid.com
محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

صیغۂ نکاح یعنی عقدِ نکاح کے الفاظ بھی اسی اسلامی ضابطے کی تائید کرتے ہیں۔ نکاح، ایجاب وقبول سے عبارت ہے۔ اِیجَاب کا مطلب ہوتا ہے کہ "ایک کو دوسرے شخص پر واجب کرنا" یعنی والد اپنی بیٹی کی ذمہ داری، دوسرے شخص پر ڈالتا ہے اور شوہر اس کو قبول کرتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ عقدِ نکاح یعنی معاہدہ میں مرد اور عورت فریق نہیں ہوتے بلکہ عورت کی طرف سے اس کا ولی اور دوسری طرف شوہر ہوتا ہے جب کہ اسرۂ نکاح کے فریق مرد اور عورت ہوتے ہیں اور جو ایجاب وقبول کے بعد وجود میں آتا ہے۔

عقدِ نکاح میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے ہی نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "عورت نہ اپنا نکاح خود کرے اور نہ دوسری عورت کا کروائے" (سنن ابن ماجہ: ص ۳۱۷) یعنی اس کام کی انجام دہی متعدد حکمتوں کی بنا پر صنفِ نازک پر ڈالی ہی نہیں گئی۔ اسی طرح حضرت عائشہ جو بزرگ ترین ہستی اور ام المومنین ہیں کا رویہ بھی یہی تھا کہ نکاح کی تمام بات چیت طے کر کے عقدِ نکاح کے وقت پیچھے ہٹ جاتیں اور ولی اور شوہر کو عقدِ نکاح منعقد کرنے دیتیں اور فرماتیں إن المرأة لاتلي عقدة النكاح۔ (دار قطنی، سنن الکبریٰ، تفسیر قرطبی، نصب الرایہ) یہی معمول ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر خطاب کا بھی تھا (مصنف عبد الرزاق: ۶/ ۲۰۰) امام زیلعی کے مطابق "دیگر ازواجِ مطہرات کا طریقہ بھی یہی تھا اور ایسی تمام احادیث صحیح ہیں" (نصب الرایہ: ۳/ ۱۸۴)

اسلام کے اس حکم کے پس پشت کیا مصلحتیں کار فرما ہیں، یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن لگے ہاتھوں اُمت کے علمی سرمائے سے اس رائے کا استدلال بھی بالاختصار ملاحظہ فرمالیجئے:

قارئین کرام! آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ اس موضوع کی تائید کرنے والی احادیث کی تعداد ۲۰۰ سے زائد ہے، حتیٰ کہ ائمہ محدثین نے لانكاح إلا بولي (ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا) کی حدیث کو متواتر احادیث کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ (احادیثِ متواترہ پر مبنی کتب: الأزهار المتناثرة ص ۱۱ اور نظم المتناثر نمبر ۱۵۷) صحیح بخاری میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں۔ ایسی ضخیم کتب بھی موجود ہیں جو صرف اس حدیث کی تمام اسناد کے ذکر پر مبنی ہیں۔ خلفاءِ راشدین، صحابہ کرام، مفسرین ومحدثین عظام اور ائمہ اربعہ کا اس مسئلہ پر اتفاق ہے کہ نکاح میں والدین کی رضامندی ضروری ہے۔

راقم نے اس موضوع پر اپنی ضخیم کتاب میں، جس میں تمام امہاتِ کتب سے کم وبیش ۵۰۰ حوالہ جات کی عبارتیں جمع کی گئی ہیں، تفصیل سے ان تمام آراء کو قلمبند کیا ہے اور اس پر اٹھائے جانے والے اعتراضات کی واضح اور دوٹوک وضاحت کی ہے۔

کونسی عقل یہ باور کرتی ہے کہ وہ اسلام جو اللہ کی اطاعت کے بعد والدین کی اطاعت کا حکم دیتا ہے، اولاد کے جان ومال پر والدین کا پورا حق تسلیم کرتا ہے (ترمذی ۱/ ۱۹۱۴، سنن ابن ماجہ ۲/ ۴۴۴)

© rasailojaraid.com
محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

حتیٰ کہ صحیح حدیث کی رُو سے اولاد کے قتل پر بھی والدین کو قصاص کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا (جامع ترمذی: ۲/۷۵) اولاد کی زندگی کے اس اہم ترین موڑ پر ان کی رضامندی کو بیک قلم غیر ضروری قرار دے گا۔

تفصیلات کا یہ موقعہ نہیں لیکن تکمیل کی غرض سے چند گزارشات توجہ کی متقاضی ہیں:

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ''نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جس عورت نے اپنے ولی کی رضامندی کے بغیر نکاح کیا تو اس کا نکاح باطل، باطل، باطل (یعنی کالعدم) ہے۔'' اس حدیث کو سنن ابن ماجہ، ابوداود، ترمذی الام از امام شافعیؒ اور دیگر ۱۰ کتبِ حدیث میں روایت کیا گیا ہے۔ اس صریح حدیث کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت عائشہ کا عمل اس کے خلاف تھا جب کہ ایسا نہیں ہے، حضرت عائشہ کا طرزِ عمل پیچھے گزر چکا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کی سند میں موجود امام زہریؒ کی بابت یہ ذکر کیا ہے کہ انہیں اس کی روایت کرنا یاد نہیں رہا۔ جب کہ یہ حدیث دیگر ایسی سندوں سے بھی مروی ہے جن میں امام زہریؒ کا واسطہ نہیں ہے۔ امام زہریؒ کی بابت یہ بات جس جگہ مذکور ہے، اس کی روایت بذاتِ خود بھی درست نہیں کیونکہ اس میں شاذ کونی نامی راوی ضعیف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ، امام ترمذیؒ، ابن حبانؒ، حاکمؒ، ابوعوانہؒ، ابن خزیمہؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ زیلعیؒ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ (فتح الباری: ۹/۱۹۱)

تمام خلفاءِ راشدین اور صحابہ کرام کے فیصلے بھی اسی امر کی تائید کرتے ہیں۔ دیکھئے فقہ جات حضرت عمرؓ (ص: ۶۵۸) وعثمانؓ (ص: ۳۵۵) اور حضرت علیؓ (سنن کبریٰ ۷/۱۱۲)

نامور فقیہ علامہ ابن منذر کے مطابق ''صحابہ کرامؓ کا اس امر پر اجماع ہے کہ والدین کی رضامندی نکاح میں ضروری ہے''۔ (نیل الاوطار: ۶/۱۱۹)

ائمہ اربعہ میں سے تین کا موقف اس ضمن میں بہت شدید ہے کہ وہ نکاح میں والدین کی رضامندی کو از بس ضروری خیال کرتے ہیں جب کہ حنفی فقہ کے بارے میں کچھ تفصیل ہے۔ فی زمانہ حنفی فقہا کا موقف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے دونوں شاگردانِ رشید (صاحبینؒ) سے قدرے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نامور حنفی علماء مثلاً علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ زیلعیؒ وغیرہ نے جو دونوں حدیثِ نبوی کا خاص ذوق رکھتے تھے موجودہ حنفی موقف کی تردید کی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے اپنی کتاب جامع المسانید میں خود نبی اکرم ﷺ کی یہ حدیث درج کی ہے کہ ''ولی اور دو گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ جو نکاح کرے اس کا نکاح باطل ہے''۔ یہی حدیث امام صاحب سے ان کے شاگرد حسن بن زیادؒ نے بھی روایت کی ہے (ملاحظہ ہو فتح القدیر: ۳/۲۵۵)...... جبکہ امام صاحب کے شاگردِ رشید امام محمد کا موقف حنفی فقہ کی معروف کتاب بدائع الصنائع میں یوں ہے:

''عورت کے لیے ولی کی اجازت (رضامندی) کے بغیر نکاح کرنا حرام ہے، اگر ایسا نکاح

© rasailojaraid.com

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

ہو جائے تو ولی کی اجازت سے قبل ملاپ حرام ہے، نہ ہی ان میں طلاق ہو گی، نہ ظہار وایلاء۔ اگر ولی کی اجازت سے قبل زوجین سے کوئی مر جائے تو دوسرا اس کا وارث بھی نہ ہوگا"

حنفی فقہ کی نامور کتاب ہدایہ میں قاضی ابو یوسفؒ کا بھی یہ موقف ذکر کیا گیا ہے کہ "نکاح ولی کے بغیر منعقد ہی نہیں ہوتا"۔ ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں امام ابو یوسفؒ کے اس قول کو دو حنفی فقہا کرخیؒ اور طحاویؒ کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے قاضی ابو یوسف کے بارے میں اسی رائے کو ترجیح دی گئی ہے۔ (ص ۲۵۹/۳)

بڑے اختصار کے ساتھ یہاں فقہ اسلامی کی بنیادی کتب کے حوالے درج کر دیئے گئے ہیں۔ عصر حاضر کے علماءِ اسلام کا موقف بھی اگر بالا ختصار درج کر دیا جائے تو مفید ہو گا:

شاہ ولی اللہ کا موقف بھی یہی ہے کہ نکاح میں والدین کی رضامندی از بس ضروری ہے۔ آپ حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی متعدد حکمتیں بھی بیان کرتے ہیں، حجۃ اللہ کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"نکاح کے بارے میں صرف عورتوں کا فیصلہ اس لیے کافی نہیں کہ وہ بھرپور معلومات والی نہیں ہوتیں۔ غلط فہمی کا شکار ہو کر بہت دفعہ مصالح کو نظر انداز کر دیتی ہیں بالخصوص اکثر خاندانی وقار کا دھیان نہیں رکھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات وہ کم تر حسب ونسب میں دلچسپی بھی رکھ لیتی ہیں جو اس کی برادری کے لیے شرم وعار کا باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ نکاح میں ان کے اولیاء (سرپرستوں) کو دخیل کیا جائے تاکہ خرابی کا راستہ بند ہو جائے۔ نیز طبعی تقاضوں کی بنا پر لوگوں کا یہ عام رواج بھی ہے کہ مرد عورتوں کے نگران ونگہبان ہوتے ہیں کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں برتری دی ہے، معاملات کے فیصلے بھی ان کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور اخراجات کے ذمہ دار بھی وہی ہوتے ہیں۔ عورتیں تو ان کے ماتحت ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مرد عورتوں کے نگران ہیں کیونکہ انسانوں میں سے بعض اصناف کو اللہ تعالیٰ نے دوسری اصناف پر (اس لحاظ سے) برتری دی ہے۔ (النساء: ۳۴)

عورتوں کے نکاح میں ولی کی شرط مردوں کے اختیارات پر زور دینے کے لیے ہی ہے کیونکہ اگر عورتیں کپڑے جھاڑ کر اس کام کو خود کرنے کے درپے ہو جائیں تو یہ بے شرمی کی بات ہو گی اور مردوں کی پروا کیے بغیر ان پر چڑھ دوڑنا ہو گا۔ نیز نکاح کو شہرت دے کر بدکاری سے ممتاز کر دکھانا بھی ضروری ہے اور تشہیر کی بہترین صورت یہ ہے کہ نکاح کے وقت سرپرست (ولی) موجود ہوں۔" (حجۃ اللہ البالغہ: ج ۲، ص ۱۲۷)

جماعتِ اسلامی کے قائد سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

© rasailojaraid.com

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

﴿وَلاَ تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ "مشرک مردوں سے اپنی عورتوں کے نکاح نہ کرو"

اس سے یہ قاعدہ معلوم ہوا کہ مرد تو اپنا نکاح خود کر لینے کا مختار ہے لیکن عورت اس معاملہ میں بالکل آزاد نہیں ہے۔ اسے کسی کے نکاح میں دینا اس کے اولیاء کا کام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حدیث "الأيم أحق بنفسها دون وليها ولا تنكح البكر حتى تستأذن" کی رو سے نکاح کے لیے عورت کی رضامندی ضروری ہے اور کسی کو اس کی مرضی کے خلاف اس کا نکاح کر دینے کا حق حاصل نہیں۔ مگر چونکہ عورت کے نکاح کا مسئلہ خاندان کے مفاد سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے قرآن مجید یہ چاہتا ہے کہ شادی کے معاملہ میں تنہا عورت کی پسند اور خواہش کافی نہ ہو بلکہ ساتھ ساتھ اس کے رشتہ دار مردوں کی رائے کو بھی اس میں شریک کیا جائے" (حقوق الزوجین، ص ۹۸)

معروف مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ لکھتے ہیں:

﴿وَلاَ تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾

"اور اپنی عورتوں کو مشرکوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں"

"لا تُنكحوا" خطاب مردوں سے ہے کہ تم اپنی عورتوں کو کافروں کے نکاح میں نہ دو۔ غور کریں کہ حکم خود عورتوں کو براہِ راست نہیں مل رہا ہے کہ تم کافروں کے نکاح میں نہ جاؤ۔ یہ طرزِ خطاب بہت پر معنی ہے اور صاف اس پر دلالت کر رہا ہے کہ مسلمان عورت کا نکاح مردوں کے واسطے سے ہی ہونا چاہیے" (ترجمہ و تفسیر: ص ۸۹)

اصل بات یہ ہے کہ نکاح میں والدین کی رضامندی اسلام کے خاندانی نظام کی ایک بنیادی کڑی ہے۔ اسلامی خاندان ایک نظم وضبط میں پرویا ہوا ہے، جس کا سربراہ مرد ہے۔ وہ معاشرے کے ابتدائی یونٹ (خاندان) میں ہر سیاہ و سفید کا ذمہ دار ہے اور گھر کا ہر ایک فرد اس کا پابند ہے۔ (دیکھئے حدیث نبویؐ......والد اپنے گھر کا ذمہ دار ہے، صحیح بخاری: ۱۱۵/۳) یہ کوئی جابرانہ تقاضا نہیں بلکہ نظم وضبط کا فطری نظام ہے جس کو خالق کائنات نے توازن واعتدال کے ساتھ انسانی فطرت میں سما کر لاگو فرمادیا ہے۔ جبکہ حقوقِ انسانی کے خوشنما نعرے میں ایک ایسے مکمل نظام کو سندِ جواز مل جاتی ہے جو والدین کے احترام واطاعت اور رشتہ داریوں میں قرب وصلہ رحمی اور ذمہ داری کے تصورات سے بالکل عاری ہے۔

لیکن یہاں والدین پر بھی چند ذمہ داریاں لاگو ہوتی ہیں۔ یوں تو ایسے معاملات میں والدین کی ذاتی پسند وناپسند کا شکار لڑکے اور لڑکیاں ہر دو ہی ہوتے ہیں۔ لیکن لڑکیاں اس معاملے میں خاموشی اختیار کرنے اور فطری کمزوری وشرافت کی بنا پر اس سے زیادہ متاثر دکھائی دیتی ہیں۔ والدین یا تو انسان ہونے

© rasailojaraid.com

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

کے ناطے اولاد کی بابت زیادہ توقعات وابستہ کر کے ان کے حق میں دخیل ہو جاتے ہیں یا اپنی اعلیٰ بصیرت ودانائی کی وجہ سے وہ جس کو پسند کرتے ہیں، اولاد اس سے مطمئن نہیں ہوتی۔

اولاد کی طرف سے بھی ایک سنگین غلطی اکثر اس بدمزگی اور حکم عدولی کی وجہ بنتی ہے اور وہ ہے عشق بازی کی تربیت اور مواقع فراہم کرنے والا ہمارا معاشرہ اور ثقافت۔ جوان لڑکے لڑکیاں بھی اکثر عشق ومحبت کے چکر میں پڑ کر ظاہری آسائش وآرائش اور حسن وزیبائش کے دامِ فریب میں آکر خیالوں کی جنت بسا بیٹھتے ہیں، بس یہیں سے تناؤ اور کشمکش کی کیفیت شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن شریعت کی تعلیمات ہمارے لیے اصل کسوٹی اور نشانِ راہ ہیں۔ شریعت ایک خاص مرحلۂ عمر کے بعد ہر انسان کو ایک مخصوص خود اعتباری اور شناخت عطا کرتی ہے جس کو عموماً والدین بھی ملحوظ نہیں رکھتے۔ شریعت اگر کسی انسان کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ اپنا اختیار بروئے کار لا سکتا ہے تو واقعتا شریعت اس وقت اس میں مطلوبہ اہلیت پاتی ہے کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکے۔ شریعت کے دیئے گئے اختیارات اور حقوق وفرائض ہی اصل انصاف وعدل ہیں، باقی سب انسان کے افراط وتفریط کے پروردہ جذبات واحساسات ہیں جنہیں شریعت کی حد بندیوں سے مربوط کرنے کی ضرورت ہے۔ شریعت ایک طرف عشق ومحبت کے نام پر پیہا بدمستیوں کی بھی شدید مخالف ہے بلکہ مرد وعورت کے آزادانہ میل ملاپ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے تو دوسری طرف ہر ایک کو جائز طور پر اپنے دائرہ کار میں مصروف اور مفید ہونے کی تعلیم بھی دیتی ہے۔

راقم اس بارے میں انصاف کے ساتھ جو کچھ سمجھ سکا ہے، وہ یہ ہے کہ شادی بیاہ جس لڑکے اور لڑکی کا ہونا ہے، اصل اہمیت بھی اسی کی پسند وناپسند کو حاصل ہے۔ لازمی ہے کہ وہ اپنے احساسات وجذبات کو خلافِ شریعت امور سے آلودہ کر کے فیصلہ نہ کرے۔ والدین کو اس موقعہ پر لڑکے کے لیے کچھ کم اور لڑکی کے لیے قدرے زیادہ طور پر اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے ان کی پسند کی تکمیل میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ مخلص ومربی ہونے کے ناطے وہ اُسے زمانے کی اونچ نیچ سے آگاہ کر سکتے ہیں، اس کی نو آموز نگاہوں کو ان مناظر سے بھی آشنا کرا سکتے ہیں جو ایک حقیقت بن کر دنیا میں موجود ہیں اور شادی شدہ زندگی میں سامنے آنے والے ہیں لیکن فیصلے کا مدار لڑکی اور لڑکے کی پسند پر ہونا چاہیے کہ زندگی انہیں گزارنا ہے۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ یہ شرعی حق اس صورت میں اولاد کو حاصل ہوتا ہے جب وہ بھی شرع کے تقاضے پورے کرتے ہوں۔ اگر وہ عشق ومحبت اور بے راہ روی کے مرتکب ہوئے ہیں تو قوتِ نافذہ شریعت نے والدین کے حق میں رکھی ہے، چیک اینڈ بیلنس کا نظام والد کے ہاتھ میں ہے جو ادارۂ خاندان کا سربراہ ومنصف ہے۔ شریعت نے بھی زوج کے انتخاب کے لیے بزبانِ نبی کریم ﷺ واضح ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ "نکاح، مال ودولت، حسب ونسب، حسن وجمال اور خلق ودینداری کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ کامیاب ہونا چاہتے ہو تو دینداری کی بنا پر فیصلہ کرو۔" (صحیح بخاری: ۵۰۹۰) ایک اور حدیث

© rasailojaraid.com
محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

میں یوں ہے کہ "جس کے تم خلق اور دینداری پر راضی ہو، اس سے نکاح کر دو۔" (ترمذی: ۱۰۰۴)

ان شرعی مصالح و مقاصد کی تکمیل کرانے کا ذمہ دار بھی گھر میں والد ہی ہے۔ غرض اولاد کا یہ حق شرعی حدود کا پابند ہے..... شریعت ایک مکمل نظامِ حیات کا نام ہے، ایک شرعی تصور اگر یہاں واضح نہ ہوا تو بات ادھوری رہ جائے گی:

اسلام نے ہر شعبۂ زندگی میں ایک مربوط نظام دیا ہے، جس کی رو سے بعض لوگ سربراہ ہیں اور بعض ماتحت۔ یہ اصول دنیا میں بھی ہر ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔ نظم وضبط کا والہ وشیدا اسلام زیردستوں کو جہاں بیسیوں ہدایات دیتا ہے وہاں حکام اور بااختیار افراد کو بھی کڑی تنبیہات دیتا ہے۔ مثال کے طور پر خاندان (جو معاشرہ، حکومت اور ریاست کا بنیادی یونٹ ہے) میں اولاد اور والدین، شوہر اور بیوی اور حاکم و رعایا کے مابین ایک سے اسلامی اصول کارفرما ہیں۔ اولاد کو ہر حال میں والدین کی اطاعت گزاری کرنا ہے حتیٰ کہ اگر وہ زیادتی بھی کریں تو اُف نہیں کہنا، شرک کا تقاضا کریں تو شرک تو نہ کیا جائے لیکن باقی ہر طرح ان کی اطاعت بجالائی جائے۔ (سورۂ لقمان:۱۵) بیوی کے لیے خاوند کو سجدہ کرنے کی حد تک اطاعت کی مشروط تلقین موجود ہے۔ (ترمذی:۱۰۷۹) اسی طرح رعایا کو اپنے حاکم کی ہر امر میں اطاعت ضروری ہے۔ حاکم کو اس وقت تک شریعت کا دیا گیا یہ حق فرمانروائی حاصل رہے گا جب تک وہ اس شریعت کے بعض مخصوص شعارات کی پیروی کرتا رہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام ماتحتوں کی طرف سے کسی حکم عدولی یا بدنظمی کا روادار نہیں ہے۔ اور یہاں حکام و ذمہ دار کو قوتِ نافذہ اور ظاہری تائید عطا کی گئی ہے۔ ذمہ داری کا یہی نظام اس حدیثِ نبوی میں بیان کیا گیا ہے۔ "تم میں ہر شخص مسئول ہے اور اس کی مسئولیت کی بابت اس سے پوچھا جائے گا......" (صحیح بخاری:۲/۱۱۵)

دوسری طرف مسئولین اگر زیادتی کریں تو ان کے احتساب کا معاملہ اللہ نے عموماً روزِ قیامت پر اُٹھا رکھا ہے۔ ان کے لیے ایسی شدید تنبیہات ہیں جو رونگٹے کھڑے کر دیتی ہیں۔ ذرا جج حضرات کے لیے اس تنبیہ کو ذہن میں لائیے: "جو شخص لوگوں کے درمیان قاضی بنا دیا گیا گویا وہ بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا" (ترمذی: ۱۲۴۷)..... ذرا حکام کی مسئولیت کا خیال ذہن میں لائیے جس سے حضرت عمرؓ کا رُواں رُواں کانپ اُٹھتا، فرمانِ نبویؐ ہے: "جو حاکم اس حالت میں فوت ہوا کہ وہ لوگوں کے حق میں ناانصافی کا مرتکب تھا تو اس پر جنت حرام کر دی گئی" (مسلم:۲۰۳)..... ذرا اُن نام نہاد ریاکار علماء کا تصور ذہن میں لائیں جن کو جہنم کے سب سے نچلے طبقے وَیل میں پھینکے جانے کی نوید دی جارہی ہے ...... لیکن نظم وضبط پر مبنی اسلامی معاشرہ میں مسئول کو ایک ظاہری تائید سے نوازا گیا ہے اور اس کا محاسبہ شدید اور کڑی دھمکیوں سے کیا گیا ہے۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ ظلم روا رکھنے پر ذرا کم تر درجے کے مسئول کے خلاف اس کے ماتحت، عدالتِ اسلامیہ سے دادرسی کر کے کچھ مداوا کر سکتے ہیں لیکن نہ ہی ہر معاملہ

© rasailojaraid.com

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

عدالت میں لے جایا جاتا ہے، نہ ہی یہ اسلام کا منشا ہے۔ اسلام داخلی خود احتسابی کا پروگرام پیش کرتا ہے، اس میں یوں بھی نہیں کہ اہل مغرب کی طرح ہر چیز کی ذمہ دار حکومت ہے بلکہ ہر ہر فرد اپنے آپ پر اور اپنے ماتحتوں کا خود ذمہ دار ہے اور ہر نچلی اکائی کامل تر ہو کر بڑی اکائی میں داخل ہوتی ہے۔

نکاح کے معاملے میں لڑکی (اولاد) کے حقوق

میرے پیش نظر مضمون جسے اُم عمارہ نے تحریر کیا ہے، میں اکثر مواد اور بحث اسی موضوع سے کی گئی ہے اور یہی وہ عدمِ توازن ہے جو محترمہ کے مضمون کا صحیح تاثر پیش کرنے میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ جب معاملہ پیچیدہ ہو اور اس میں ایک سے زیادہ فریق ہوں، بیسیوں دیگر عناصر وعوامل کار فرما ہوں اور اس کا دائرہ کار اجتماعی حیاتِ انسانی کو شامل ہو اور موضوع کا تعلق بھی ایسے کلیدی مسئلے سے ہو جس پر کسی فکر کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے تو وہاں تشنہ مباحث کی اشاعت پریشان فکری کی طرف لے جاتی ہے۔

غالباً محترمہ نے یہ تحریر کسی ایک طرف سے متاثر ہو کر لکھی ہے یا محترمہ ردِّ عمل کا شکار ہیں تب ہی ان کی تحریر میں جانبداری کا عنصر قدرے نمایاں ہے۔ انہوں نے بعض احادیث کے ترجمے اور متن میں ایسی باتیں شامل کر دی ہیں جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں۔

اسلام میں جہاں یہ امر متفقہ ہے کہ نکاح میں والدین کی رضامندی ضروری ہے، وہاں اس سے بھی زیادہ اس امر پر اتفاق موجود ہے کہ نکاح میں لڑکی (اور لڑکے) کی رضامندی از بس ضروری ہے اور زبردستی کیا جانے والا نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہوتا۔ اس موضوع پر بھی حدیثِ نبوی کے ذخیرے میں متعدد احادیث ملتی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر محترمہ نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ لیکن ان احادیث سے یہ مطلب اَخذ کر لینا بھی سراسر انتہاپسندی ہے کہ لڑکی کی رضامندی کے نام پر والدین کی یا ولی کی شرکت کوئی ضروری امر نہیں اور یہ محض اضافی تکلف ہے یا والدین کی شرکت نکاح میں فقط پسندیدہ امر ہے اور لڑکی کو اپنے نکاح کرنے کے جملہ حقوق خود حاصل ہیں۔ بیان کردہ احادیث سے قطعاً یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ احادیث اور دیگر نصوصِ شریعت کے بارے میں یہ بات ملحوظ رکھنا اشد ضروری ہے کہ شریعت ہر معاملے میں ایک مستقل نظام دیتی ہے جو صرف ایک یا دو عبارتوں میں مکمل نہیں ہو جاتا۔ بلکہ کسی موضوع پر تمام ذخیرۂ احادیث و قرآن کو جمع کر کے ہی ایک صحیح رائے تک پہنچا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ دوسری طرف کی احادیث کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ ورنہ یہ اسلام کی درست ترجمانی نہیں بلکہ شریعت کے نام پر افراط و تفریط ہوگا۔ یہاں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی اس عبارت کا تذکرہ مناسب ہوگا جس میں امام ابو حنیفہ کے موقف کی شرح کرتے ہوئے انہوں نے اسی رائے کی تائید کی ہے:

© rasailojaraid.com

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

"امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ جب ولی اور عورت کی رائے میں تضاد پایا جائے تو عورت کی رضامندی کی اہمیت ہوگی۔ اگرچہ عورت اپنی ولی کی رضامندی حاصل کرنے کی پابند ہے، اس طرح ولی عورت کی رضامندی حاصل کرنے کا بھی پابند ہے۔ معاملے کی نزاکت کے پیش نظر دونوں کی رضامندی انتہائی ضروری ہے اور کسی کی ہٹ دھرمی قابل قبول نہیں۔

مزید لکھتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ حدیث لانكاح إلا بولي حسن (معتبر) ہے اور کئی محدثین نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اس مسئلہ میں تحقیق پر مبنی رائے یہ ہے، جو بحث و تمحیص کے بعد ثابت شدہ ہے کہ شریعت میں ہر وہ کام جو جماعت سے تعلق رکھتا ہو اس میں طرفین کی احادیث کو جمع کر کے دونوں کے مقصود پر عمل کیا جائے۔ ایسی صورتوں میں سے ایک نکاح بھی ہے۔ اس میں دونوں طرح کی احادیث وارد ہیں جب عورتوں کو مخاطب کیا تو انہیں بتایا کہ ان پر ان کے اولیاء کا حق ہے۔ حتیٰ کہ یہ خطرہ ہو گیا کہ عورتوں کا کوئی حق باقی نہیں رہا، جیسا کہ اس حدیث میں ہے "أيما امرأة نكحت بغير إذن وليها فنكاحها باطل فنكاحها باطل فنكاحها باطل" اس تکرار کا مقصد ولی کی اجازت کی ضروری تاکید اور مبالغہ ہے اور جب اولیاء کی طرف توجہ فرمائی تو انہیں فرمایا کہ "الأيم أحق بنفسها من وليها" گویا کہ ولی کا کوئی جبر نہیں۔ تو ان دونوں طرح کی حدیثوں میں ہر ایک میں ایک حصہ بیان ہوا اور اصل مقصد دونوں پر اکٹھا عمل کرنا ہے۔...... دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ولی عورت کی رضامندی کو پیش نظر رکھے اور عورت ولی کی اجازت اور نکاح میں ولی کی شراکت کا اہتمام کرے۔ نہ عورتیں مردوں کی حدود سے آگے جائیں اور نہ مرد عورتوں پر زیادتی کریں۔

کیا ولی کی اجازت بطور مصلحت پیش نظر ہے یا عورت کے حق کا خیال رکھا گیا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ ولی کا حق ہے اور اسی کی مصلحت کے پیش نظر ہے۔ جب کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ عورت کی مصلحت کے لیے ہے کیونکہ عورت ناقص معلومات والی اور کمزور سوچ والی واقع ہوئی ہے، اکثر اپنی مصلحت نہیں سمجھتی اور نہ ہی حسب و نسب کی حفاظت کر سکتی ہے۔ غیر کفو (مرتبہ میں کمتر) کی طرف راغب ہو جاتی ہے جس سے اسکے ولی کو عار لاحق ہوتی ہے لہٰذا ولی کو شرط قرار دیا گیا ہے تاکہ یہ دروازہ بند ہو جائے۔" (فیض الباری شرح البخاری ۴؍۲۸۲ تا ۲۸۷)

اس ضمن میں چند ایک اُمور خاص طور پر قابل توجہ ہیں:

۱۔ محترمہ نے لکھا ہے کہ "والدین / ولی کی نکاح میں شرکت ہونی چاہیے۔" یہ تائیدی جملہ ان شرعی مقاصد کی قطعاً تکمیل نہیں کرتا جو اس موقع پر والدین کی شرکت کے بغیر پورے نہیں ہوتے۔ یہ مان لئے بنا چارہ نہیں کہ جس طرح لڑکی (اور لڑکے) کی رضامندی کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا، اسی

© rasailojaraid.com

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

طرح والدین یا ولی کی عدمِ شرکت بھی نکاح کو باطل کر دینے کو کافی ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی دلائل پیچھے گزر چکے ہیں۔

۲۔ محترمہ اُمِ عمارہ نے اپنے مضمون میں سنن ابن ماجہ سے حضرت بریدہ سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ ایک عورت نے اپنے والد کے کروائے نکاح پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو آپ نے نکاح کو باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار عورت کے ہاتھ میں دے دیا تو یہ سن کر عورت نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا کہ "میں عورتوں کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ نکاح کے معاملے میں باپ دادا کا کوئی ہاتھ نہیں"

یہ حدیث صحیح بخاری میں مروی ہے اور ابتدائی حصے تک درست ہے لیکن آخری جملہ "میں بتا دینا چاہتی ہوں......" ابن ماجہ میں ہے لیکن یہ جملہ صحتِ سند کے ساتھ ثابت نہ ہو سکا ہے۔ (ضعیف سنن ابن ماجہ: ص ۱۴۵) چنانچہ آخری ٹکڑا حدیثِ نبوی کے الفاظ نہیں یعنی حدیثِ تقریری کا جز نہیں۔

۳۔ مضمون کی ابتدا میں صحیح مسلم کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کے فرمان کا خلاصہ ذکر کیا گیا ہے کہ "مطلقہ اور بیوہ عورت سے زیادہ ولی کا اختیار نہیں ہے۔ اور کنواری عورت کی اجازت ضروری ہے"

اس حدیث سے ولی کے اختیار کو کمتر قرار دینا بھی درست نہیں۔ اول یہاں مطلقہ اور بیوہ کے لئے آیّم کا لفظ ہے جو شوہر دیدہ عورت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جس کے مقابلے میں، بعد میں کنواری کا تذکرہ بھی حدیث میں موجود ہے...... اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کنواری اور شوہر دیدہ (مطلقہ یا بیوہ) عورت کے احکامات میں قدرے فرق ہے:

پہلا فرق یہ ہے کہ آیّم عورت کی رضامندی فقط خاموشی سے کافی نہیں۔ جبکہ کنواری کے زیادہ حیادار ہونے کی وجہ سے اس کی خاموشی جو اثبات کی مؤید ہو، سے ہی نکاح کی رضامندی سمجھی جا سکتی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ یہاں آیّم کے لئے احقّ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ آیم، ولی سے زیادہ حقدار ہے۔ اس کا مطلب اس کتابِ صحیح مسلم کے شارح امام نوویؒ کی زبانی سنئے:

"احق کا لفظ آیم اور ولی دونوں کے حق کو بیان کر کے اَیم کے حق کی فوقیت کو بیان کر رہا ہے۔ یعنی اس میں ولی کے حق کی نفی نہیں بلکہ کمتری واضح کی جا رہی ہے"

مشہور حنفی محدث علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں:

"نبی کریم نے آیّم کیلئے حق ٹھہرایا ہے اور اسے زیادہ حقدار کے طور پر پیش کیا ہے جبکہ نکاح کروانا ولی کی ہی ذمہ داری ہے اور اسے عورت کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح نہیں کرنا چاہئے"

مطلب یہ ہوا کہ آیّم عورت چونکہ تجربہ کار ہوتی ہے اور معاملے کو سمجھتی ہے لہٰذا اب ولی پر اس کی رائے کو ترجیح دی جائی گی۔ جبکہ کنواری کے بارے میں ولی اجازت لینے کے بعد قدرے زیادہ حق رکھتا ہے

© rasailojaraid.com

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

خلاصہ ٔ کلام

اس ساری بحث سے یہ بات بالکل سامنے آجاتی ہے کہ نکاح میں والدین کا کردار یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کے نکاح کو منعقد کروائیں یعنی اولاد کی مرضی پر مبنی نکاح والدین کے توسط سے ہی پایہ ٔ تکمیل کو پہنچے تاکہ بالخصوص لڑکی کسی وقتی جذبے یا بے وقوفی کا شکار ہو کر غلطی نہ کر بیٹھے اور والد بھی اپنی لڑکی کے نفع و نقصان کا خود خوب تجزیہ کرلے کیونکہ بصورتِ طلاق یا خاوند کی وفات کے بعد اس کی بیٹی کی کفالت اور رہائش وغیرہ کی ذمہ داری والد کی طرف ہی لوٹنے والی ہے۔ زندگی کا یہ اہم ترین معاملہ والدین اور اولاد کی باہمی رضامندی سے ہی طے پانا ضروری ہے اور شریعت نے ہر دو کے حقوق کو اس میں پوری طرح محفوظ کردیا ہے...... اس بحث کا خلاصہ ہم ایک جملہ میں یوں نکالتے ہیں کہ ”اسلام میں اولاد کا نکاح، ان کی رضامندی سے والدین کے ذریعے منعقد ہوتا ہے“۔ رضامندی کا مطلب قطعاً یہ نہ سمجھا جائے کہ اولاد انتخاب کے مراحل سے خود گزر کر آخر میں والدین کو شامل کرلے۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ عرف روایت اور اسلام کی رُو سے زوج کی چھان پھٹک اور اس حوالے سے مختلف امکانات کا جائزہ والدین کی ذمہ داری ہے جس کو حتمی نتیجے پر پہنچانے سے قبل وہ اولاد سے بھی رضامندی حاصل کرنے کے پابند ہیں۔

یہ تو وہ تمام قانونی بحث ہے جس کی حد بندی شریعتِ مطہرہ نے اختلاف پڑنے کی صورت میں واضح کردی ہے، لیکن اگر اولاد اور والدین میں اعتماد کا رشتہ ہے اور جیسا کہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے تو ان باریکیوں میں پڑے بغیر بھی یہ مرحلہ ٔ نکاح خوش اسلوبی سے انجام پاسکتا ہے۔ لیکن ہر دو فریق کے سامنے شرعی تقاضے واضح رہنے چاہئیں اور انہیں دوسرے کی حق تلفی سے از خود گریز کی راہ اپنانی چاہئے۔

اس موضوع پر جناب نعیم صدیقی کا معاشرتی تجزیہ پر مبنی ایک خوبصورت کتابچہ ہے جس کے ایک اقتباس پر میں اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔ جناب صدیقی نے یہاں لڑکی کے لئے حق قبول کرکے اس حق کی استعمال دہی پر ولی کو نگران بتایا ہے کہ یہ حق اس کے ذریعے استعمال کیا جائے:

> والدین اور اولاد کے اشتراک کی نوعیت اس مثال سے سمجھئے...... ”مثلاً آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک فرم کے ملازم کا یہ قانونی طور پر طے شدہ حق ہے کہ وہ پندرہ دن کی بلا تنخواہ چھٹی ہر سال لے سکتا ہے یا ایک سے زائد سالوں کی چھٹیاں اکٹھی کرسکتا ہے۔ مگر طریقہ یہ نہیں کہ وہ چھٹی کا فیصلہ گھر بیٹھے یکایک کسی بھی تاریخ کو کرلے اور اپنے کسی افسر یا منیجر کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دے، کیونکہ یہ اس کا حق ہے جسے کوئی شخص منسوخ نہیں کرسکتا۔ بلکہ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ منیجر کو درخواست دے اور چھٹیوں کی تاریخیں لکھے اور پھر اس کی منظوری ملنے پر چھٹیاں منائے۔ منیجر یا اس کا سیکرٹری اس سے بات کرے گا کہ خاص ان تاریخوں میں مشکلات یہ ہیں کہ ۲۲ افراد

© rasailojaraid.com

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
© rasailojaraid.com

پہلے ہی چھٹی پر ہیں۔ بروئے قواعد اتنے افراد کو اکٹھے چھٹی نہیں مل سکتی۔ (سوائے کسی خاص ہنگامی حادثے یا قومی ضرورت کے) دوسرے، ہمیں چند دن غور کر کے پندرہ دن کے لیے دفتر یا فرم کا انتظام سوچنا ہے، ابھی دو چار دن تم ٹھہر جاؤ۔

دیکھیے اس ملازم کا حق بھی واضح طور پر تسلیم شدہ ہے، مگر وہ منیجر سے بالا اقدام نہیں کر سکتا بلکہ دونوں میں مشورہ ہوتا ہے اور کوئی درمیانی صورت طے ہو جاتی ہے۔ مثلاً تم ۱۰ دن بعد رخصت شروع کرو، یا فی الحال تو ایک ہی ہفتہ کی چھٹی لو، باقی پھر لے لینا۔

ملازم کا حق قطعی ہے اور فائق، مگر اس پر عمل منیجر کے مشورے ہی سے ہوگا اور بغیر کسی نزاع کے ہوگا۔ لڑکی اور ولی کے باہمی حقوق کی نوعیت بھی یوں ہی ہے۔

یہی بات ہے کہ جب کہا جاتا ہے کہ الایم أحق بنفسها اس حقیقت کے باوجود ولی کی حیثیت ہے اور قائم ہے اور دونوں کو ایّم کے اختیار، انتخابِ شوہر میں آزادی کے ساتھ ساتھ أن یستأمر کا حکم ولی کو ہے، یعنی ولی "پارٹ اینڈ پارسل" ہے نکاح کی کاروائی کا، اگرچہ أیم کی رائے کو جبراً وہ بدل نہیں سکتا ہے۔ لیکن نکاح سے پہلے ہفتہ، مہینہ یا کچھ عرصہ وہ اس مسئلے پر مشورہ کریں گے اور مجوزہ شوہر کے متعلق یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ اس کے کیا کیا اثرات خاندان پر یا گھر پر پڑیں گے، یہ بھی معلوم کرنا ہوگا کہ اس کے گھر کا نقشہ کیا ہے اور اس کے خاندان کے حالات کیا ہیں۔ ولی تعاون کرے گا، جبر نہیں کرے گا۔ مگر عقل یہ کہتی ہے کہ شریعت ایسا ہی چاہتی ہے۔"

نبی اکرم ﷺ کے ذکرِ مبارک پر مبنی سورۂ کریمہ اَلَمْ نَشْرَحْ ...... کی خوبصورت خطاطی

© rasailojaraid.com

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ